

تفسير القرآن

الفجر

(٨٩)

الفَجْرُ

نام | پہلے ہی لفظ **وَالْفَجْرِ** کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | اس کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب مکہ معظمہ میں اسلام قبول کرنے والوں کے خلاف ظلم کی کچی چٹنی شروع ہو چکی تھی۔ اسی بنا پر اہل مکہ کو عداوت نمود اور فرعون کے انجام سے خبردار کیا گیا ہے۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع آخرت کی جزا اور سزا کا اثبات ہے جس کا اہل مکہ انکار کر رہے تھے۔ اس مقصد کے لیے جس طرح ترتیب دار استدلال کیا گیا ہے، اس کو اُسی ترتیب کے ساتھ غور سے دیکھیے۔

سب سے پہلے فجر اور درس راتوں اور حُجَّت اور طاق، اور رخصت ہوتی ہوئی رات کی قسم کھا کر سامعین سے سوال کیا گیا ہے کہ میں بات قائم انکار کر رہے ہو اُس کے برحق ہونے کی شہادت دینے کے لیے کیا یہ چیزیں کافی نہیں ہیں؟ آگے حواشی میں ان چاروں چیزوں کی جو تشریح ہم نے کی ہے اُس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ چیزیں اُس باقاعدگی کی علامت ہیں جو شب و روز کے نظام میں پائی جاتی ہے، اور ان کی قسم کھا کر یہ سوال اس معنی میں کیا گیا ہے کہ خدا کے قائم کیے ہوئے اس حکیمانہ نظام کو دیکھنے کے بعد بھی کیا اس امر کی شہادت دینے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ یہ نظام میں خدا نے قائم کیا ہے اُس کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے کہ وہ آخرت برپا کرے، اور اس کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان سے اس کے اعمال کی باز پرس کرے؟

اس کے بعد انسانی تاریخ سے استدلال کرتے ہوئے بطور مثال عداوت نمود اور فرعون کے انجام کو پیش کیا گیا ہے کہ جب وہ حد سے گزر گئے اور زمین میں انہوں نے بہت فساد مچایا تو اللہ کے عذاب کا کوڑا اُن پر برس گیا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ کائنات کا نظام کچھ اندھی بہری طاقتیں نہیں چلا رہی ہیں، نہ یہ دنیا کسی سچے نیٹ راجہ کی اندھیر نگری ہے، بلکہ ایک فرمانروائے حکیم دو اناس پر حکمرانی کر رہا ہے جس کی حکمت اور عدلی کا یہ تقاضا خود اس دنیا میں انسانی تاریخ کے اندر مسلسل نظر آتا ہے۔ کہ عقل اور اخلاقی جس دے کر جس مخلوق کو اس نے بیان تصرف کے اختیار دے دیے ہیں اس کا

محاسبہ کرے اور اسے جزا اور سزا دے۔

اس کے بعد انسانی معاشرے کی عام اخلاقی حالت کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں عرب جاہلیت کی حالت تو اُس وقت سب کے سامنے عملاً نمایاں تھی، اور خصوصیت کے ساتھ اُس کے دو پہلوؤں پر تنقید کی گئی ہے۔ ایک، لوگوں کا مادہ پرستانہ نقطہ نظر جس کی بنا پر وہ اخلاق کی بھلائی اور برائی کو نظر انداز کر کے محض دنیا کی دولت اور جاہ و منزلت کے حصول یا فقدان کو عزت و ذلت کا معیار قرار دینے بیٹھے تھے اور اس بات کو بھول گئے تھے کہ نہ دولت مندی کوئی انعام ہے، نہ رزق کی تنگی کوئی سزا، بلکہ اللہ تعالیٰ ان دونوں حالتوں میں انسان کا امتحان لے رہا ہے کہ دولت پا کر وہ کیا رویہ اختیار کرتا ہے اور تنگ دستی میں مبتلا ہو کر کس رویہ پر چل پڑتا ہے۔ دوسرے، لوگوں کا یہ طرز عمل کہ یتیم بچہ باپ کے مرتے ہی اُن کے ہاں کس پر سہ میں مبتلا ہو جاتا ہے، غریبوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا جس کا بس چلتا ہے مرنے کی ساری میراث سمیٹ کر بیٹھ جاتا ہے اور کمدر حق داروں کو دھنا بتا دیتا ہے، اور مال کی حمد میں لوگوں کو ایک ایسی نہ بچھنے والی پیاس کی طرح لگی ہوئی ہے کہ خواہ کتنا ہی مال مل جائے ان کا دل سیر نہیں ہوتا۔ اس تنقید سے مقصود لوگوں کو اس بات کا قائل کرنا ہے کہ دنیا کی زندگی میں جن انسانوں کا یہ طرز عمل ہے اُن کا محاسبہ آخر کیوں نہ ہو۔

پھر کلام کو اس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ محاسبہ ہو گا اور ضرور ہو گا اور وہ اُس روز ہو گا جب اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہوگی۔ اُس وقت جزا و سزا کا انکار کرنے والوں کی سمجھ میں وہ بات آجائے گی جسے آج وہ سمجھانے سے نہیں مان رہے ہیں، مگر اُس وقت سمجھنے کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ منکر انسان ہاتھ ملتا رہ جائیگا کہ کاش میں نے دنیا میں اس دن کے لیے کوئی سامان کیا ہوتا۔ مگر یہ ندامت اُسے خدا کی سزا سے نہ بچا سکے گی۔ الیہ جن انسانوں نے دنیا میں پورے اطمینان قلب کے ساتھ اُس حق کو قبول کر لیا ہو گا جسے آسمانی صحیفے اور خدا کے انبیاء پیش کر رہے تھے، خدا اُن سے راضی ہو گا اور وہ خدا کے عطا کردہ اجر سے راضی ہوں گے، انہیں دعوت دی جائے گی کہ وہ اپنے رب کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہوں اور جنت میں داخل ہو جائیں۔



سُورَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ ۱۰ آيَاتُهَا ۳۰

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
 وَالْفَجْرِ ۱) وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۲) وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۳) وَاللَّيْلِ
 إِذَا يَسْرِ ۴) هَلْ فِي ذَلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حَجْرِ ۵)

قسم ہے فجر کی، اور دس راتوں کی، اور حُجَّت اور طاق کی، اور رات کی جبکہ وہ رخصت ہو رہی ہو۔ کیا اس میں کسی صاحب عقل کے لیے کوئی قسم ہے؟

۱۔ ان آیات کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہوا ہے، حتیٰ کہ "حُجَّت اور طاق" کے بارے میں تو ۲۶ اقوال ملتے ہیں۔ بعض روایات میں ان کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی منسوب کی گئی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی تفسیر حضور سے ثابت نہیں ہے، ورنہ ممکن نہ تھا کہ صحابہ اور تابعین اور بعد کے مفسرین میں سے کوئی بھی آپ کی تفسیر کے بعد خود ان آیات کے معنی متعین کرنے کی جرأت کرتا۔

انماز بیان پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پہلے سے کوئی بحث چل رہی تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بات پیش فرما رہے تھے اور منکرین اُس کا انکار کر رہے تھے۔ اس پر حضور کے قول کا اثبات کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ قسم ہے فلاں اور فلاں چیزوں کی۔ مطلب یہ تھا کہ ان چیزوں کی قسم، جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے ہیں وہ برحق ہے۔ پھر بات کو اس سوال پر ختم کر دیا گیا کہ کیا کسی صاحب عقل کے لیے اس میں کوئی قسم ہے؟ یعنی کیا اس جن بات پر شہادت دینے کے لیے اس کے ٹوکسی اور قسم کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ کیا یہ قسم اس کے لیے کافی نہیں ہے کہ ایک بو شہمنہ انسان اُس بات کو مان لے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں؟

اب سوال یہ ہے کہ وہ بحث نفی کیا جس پر ان چار چیزوں کی قسم کھائی گئی۔ اس کے لیے ہمیں اُس پورے مضمون پر غور کرنا ہو گا جو بعد کی آیتوں میں "تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے عاد کے ساتھ کیا کیا" سے شروع ہو کر سورۃ کے آخر تک چلتا ہے۔ اُس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بحث جزا و سزا کے بارے میں تھی جس کو ماننے سے اہل مکہ انکار کر رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُنہیں اُس کا قائل کرنے کے لیے مسلسل تبلیغ و تلقین فرما رہے تھے۔ اس پر فجر، اور دس راتوں اور حُجَّت اور طاق، اور رخصت ہوتی ہوئی رات کی قسم کھا کر فرمایا گیا کہ اس بات کو باور کرنے کے لیے کیا یہ چار چیزیں کافی نہیں ہیں کہ کسی صاحب عقل آدمی کے سامنے اور کوئی چیز پیش کرنے کی ضرورت ہو؟

ان قسموں کا یہ موزع و محل متعین ہو جانے کے بعد لامحالہ ہمیں ان میں سے ہر ایک کے وہ معنی لینے ہوں گے جو

بعد کے مضمون پر دلالت کرتے ہوں۔ سب سے پہلے فرمایا "فجر کی قسم"۔ فجر کی قسم کو کھینے کو کہتے ہیں، یعنی وہ وقت جب رات کی تاریکی میں سے دن کی ابتدائی روشنی مشرق کی طرف ایک سفید دھاری کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ پھر فرمایا "دس راتوں کی قسم"۔ سلسلہ بیان کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد جبینے کی تیس راتوں میں سے ہر دس راتیں ہیں۔ پہلی دس راتیں وہ جن میں چاند ایک باریک ناخن کی شکل سے شروع ہو کر ہر رات کو بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ آدھے سے زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ دوسری دس راتیں وہ جن میں رات کا بڑا حصہ چاند سے روشن رہتا ہے۔ آخری دس راتیں وہ جن میں چاند چھوٹے سے چھوٹا اور رات کا بیشتر حصہ تاریک سے تاریک نہ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ جبینے کے خاتمے پر پوری رات تاریک ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا "جنت اور طاق کی قسم"۔ جنت اُس عدد کو کہتے ہیں جو دو برابر کے حصوں میں تقسیم ہوتا ہے، جیسے ۲-۴-۶-۸۔ اور طاق اُس عدد کو کہتے ہیں جو تقسیم نہیں ہوتا، جیسے ۱-۳-۵۔ عمومی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس سے مراد کائنات کی تمام چیزیں ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ہر چیز یا تو جوڑا ہوگا ہے یا تنہا۔ لیکن چونکہ یہاں بات دن اور رات کی ہو رہی ہے، اس لیے سلسلہ مضمون کی مناسبت سے جنت اور طاق کا مطلب تغیر ایام ہے کہ جبینے کی تاریخیں ایک سے دواور دوسرے تین ہوتی جاتی ہیں اور ہر تغیر ایک نئی کیفیت لے کر آتا ہے۔ آخر میں فرمایا "رات کی قسم"۔ جگہ جگہ نصت ہو رہی ہو، یعنی وہ تاریکی جو سورج غروب ہونے کے بعد سے دنیا پر چھائی ہوئی تھی، خاتمے پر آگلی ہوا اور پوچھنے والی ہو۔

اب ان چاروں چیزوں پر ایک مجموعی نگاہ ڈالیں۔ جن کی قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جزا و سزا کی جو خبر دے رہے ہیں وہ برحق ہے۔ یہ سب چیزیں اس حقیقت پر دلالت کر رہی ہیں کہ ایک ربّ قادر اس کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے، اور وہ جو کام بھی کر رہا ہے بے ننگا، بے مقصد، بے حکمت، بے مصلحت نہیں کر رہا ہے بلکہ اُس کے ہر کام میں مریجا ایک حکیمانہ منصوبہ کار فرما ہے۔ اُس کی دنیا میں تم یہ کبھی نہ دیکھو گے کہ ابھی رات ہے اور یکا یک سورج نصف النہار پر آکھڑا ہوا۔ یا ایک روز چاند ہلال کی شکل میں طلوع ہوا اور دوسرے روز چودھویں رات کا ہوا چاند نمودار ہو جائے۔ یا رات آئی ہو تو کسی طرح اس کے ختم ہونے کی نوبت ہی نہ آئے اور وہ مستقل طور پر پھیر کر رہ جائے۔ یا تغیر ایام کا سر سے سے کوئی باقاعدہ سلسلہ ہی نہ ہو کہ آدمی تاریکیوں کا کوئی حساب رکھ سکے اور یہ جان سکے کہ یہ کونسا مہینہ ہے، اس کی کونسی تاریخ ہے، اس تاریخ سے اُس کا کونسا کام شروع اور کب ختم ہوتا ہے، گرمی کے موسم کی تاریخیں کونسی ہیں اور برسات یا سردی کے موسم کی تاریخیں کونسی۔ کائنات کی دوسری بے شمار چیزیں کو چھوڑ کر اگر آدمی شب و روز کی اس باقاعدگی ہی کو آنکھیں کھول کر دیکھے اور کچھ دماغ کو سوچنے کی تکلیف بھی دے تو اسے اس امر کی شہادت ملے گی کہ یہ زبردست نظم و ضبط کسی قادر مطلق کا قائم کیا ہوا ہے اور اسکے قیام سے اُس مخلوق کی بے شمار مصلحتیں وابستہ ہیں جسے اُس نے اس زمین پر پیدا کیا ہے۔ اب اگر ایسے حکیم و دان اور قادر و توانا خالق کی دنیا میں رہنے والا کوئی شخص آخرت کی جزا و سزا کا انکار کرتا ہے تو وہ دو جہانوں میں سے کسی ایک حماقت میں لامحالہ مبتلا ہے۔ یا تو وہ اُس کی قدرت کا منکر ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کائنات کو

الْمُتْرِكِيفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۖ إِرْمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۗ الَّتِي

تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا اونچے ستونوں والے عمارم کے ساتھ جن کے

ایسے بے نظیر نظم کے ساتھ پیدا کر دینے پر تو قادر ہے مگر انسان کو دوبارہ پیدا کر کے اسے جزا و سزا دینے پر قادر نہیں ہے۔ یا وہ اس کی حکمت و دانائی کا شکر ہے اور اس کے بارے میں یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ اُس نے دنیا میں انسان کو عقل اور اختیارات دے کر پیدا تو کر دیا مگر وہ نہ تو اُس سے کبھی یہ حساب لے گا کہ اس نے اپنی عقل اور اپنے اختیارات سے کام کیا یا اور نہ اچھے کام کی جزا دے گا نہ برے کام کی سزا۔ ان دونوں باتوں میں جس بات کا بھی کوئی شخص قائل ہے وہ پہلے درجے کا احمق ہے۔

۷ جزا و سزا پر مشب و روز کے نظام سے استدلال کرنے کے بعد اب اُس کے ایک یقینی حقیقت ہونے پر انسانی تاریخ سے استدلال کیا جا رہا ہے۔ تاریخ کی چند معروف قوموں کے طرز عمل اور ان کے انجام کے ذکر سے مفصروں نے بتانا ہے کہ یہ کائنات کسی اندھے بہرے قانونِ فطرت پر نہیں چل رہی ہے بلکہ ایک خدائے حکیم اس کو چلا رہا ہے اور اُس خدائی میں صرف ایک وہی قانون کار فرما نہیں ہے جسے تم قانونِ فطرت سمجھتے ہو، بلکہ ایک قانونِ اخلاق بھی کار فرما ہے جس کا لازمی تقاضا مکافاتِ عمل اور جزا اور سزا ہے۔ اس قانون کی کار فرمائی کے آثار خود اس دنیا میں بھی بار بار ظاہر ہوتے رہے ہیں جو عقل رکھنے والوں کو یہ بتاتے ہیں کہ سلطنتِ کائنات کا مزاج کیا ہے۔ یہاں جن قوموں نے بھی آخرت سے بے فکر اور خدا کی جزا و سزا سے بے خوف ہو کر اپنی زندگی کا نظام چلایا وہ آخر کار ناسد و مُفسد بن کر رہیں، اور جو قوم بھی اس راستے پر چلی اُس پر کائنات کے رب نے آخر کار عذاب کا کوڑا برسایا۔ انسانی تاریخ کا یہ مسلسل تجربہ دو باتوں کی واضح شہادت دے رہا ہے۔ ایک یہ کہ آخرت کا انکار ہر قوم کو بگاڑنے اور بالآخر تباہی کے غار میں دھکیل دینے کا موجب ہوا ہے اس لیے آخرت فی الواقع ایک حقیقت ہے جس سے منکرانے کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو ہر حقیقت سے منکرانے کا ہوا کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جزائے اعمال کسی وقت مکمل طور پر بھی واقع ہونے والی ہے، کیونکہ فساد کی آخری حد پر پہنچ کر عذاب کا کوڑا جن لوگوں پر برسائے گا سے پہلے صدیوں تک بہت سے لوگ اُس فساد کے بیچ لوکر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور اُن پر کوئی عذاب نہ آیا تھا۔ خدا کے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی وقت اُن سب کی باز پرس بھی ہو اور وہ بھی اپنے کیسے کی سزا پائیں (قرآن مجید میں آخرت پر تین تاریخی اور اخلاقی استدلال جگہ جگہ کیا گیا ہے اور ہم نے ہر جگہ اُس کی تشریح کی ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: تفسیر القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵-۶، بولس، حاشیہ ۱۲، ہود، حواشی ۵۷-۵۸-۱۱۵-۱۱۶، ابراہیم، حاشیہ ۹، جلد سوم، النمل، حواشی ۶۶-۸۶، الروم، حاشیہ ۸، جلد چہارم، سبأ، حاشیہ ۲۵-۲۶، ص، حواشی ۲۹-۳۰، المؤمن، حاشیہ ۸-۱۰، الذخان، حواشی ۳۳-۳۴، الحج، حواشی ۲۷-۲۸، جلد پنجم، ق، حاشیہ ۱۷، الذاریات حاشیہ ۲۱)۔

لَمْ يَخْلُقْ مِثْلَهَا فِي الْبِلَادِ ۝۸ وَتَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَةَ بِالْوَادِ ۝۹
وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۝۱۰ الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝۱۱ فَكَثُرُوا فِيهَا
الْفَسَادَ ۝۱۲ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝۱۳ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمُرْصَادِ ۝۱۴

مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؟ اور تمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں
تراشی تھیں؟ اور فرعون والے فرعون کے ساتھ؟ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں
بڑی سرکشی کی تھی اور ان میں بہت فساد پھیلا یا تھا۔ آخر کار تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوزرا
برسا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے۔

۱۲ عاد ارم سے مراد وہ قدیم قوم عاد ہے جسے قرآن مجید اور تاریخ عرب میں عاد اولیٰ کا نام دیا گیا
ہے۔ سورہ نجم میں فرمایا گیا ہے کہ وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَىٰ رآیت ۵۰ اور یہ کہ اُس نے قدیم قوم عاد
کو ہلاک کیا، یعنی اُس قوم عاد کو جس کی طرف حضرت ہمدانی بھیجے گئے تھے اور جس پر عذاب نازل ہوا تھا۔ اُس کے
مقابلہ میں تاریخ عرب اس قوم کے اُن لوگوں کو جو عذاب سے بچ کر بعد میں پھلے پھولے تھے عادِ اُخریٰ کے نام سے
یاد کرتی ہے۔ قدیم قوم عاد کو عادِ ارم اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ سامی نسل کی اُس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو ارم
بن سام بن نوح علیہ السلام سے چلی تھی۔ اسی شاخ کی کئی دوسری ضمنی شاخیں تاریخ میں مشہور ہیں جن میں سے
ایک تمود ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے اور دوسرے آرامی (Aramaic) ہیں جو ابتداءً شام کے شمالی
علاقوں میں آباد تھے اور جن کی زبان آرامی (Aramaic) سامی زبانوں میں بڑا اہم مقام رکھتی ہے۔

عاد کے لیے ذات العماد (اوپرچے ستونوں والے) کے الفاظ اس لیے استعمال کیے گئے ہیں کہ وہ بڑی بڑی
بند عمارتیں بناتے تھے اور دنیا میں اونچے ستونوں پر عمارتیں کھڑی کرنے کا طریقہ سب سے پہلے انہی نے شروع
کیا تھا۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ اُن کی اس خصوصیت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ حضرت ہمدانی نے اُن سے فرمایا
أَتَبْنُونَ بِمِثْلٍ نَّعَبْتُونَ وَتَنْتَعِلُونَ وَتَمَّصَاتُ عِلْمُكُمْ تَخْلُدُونَ ۝ یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر
اوپرچے مقام پر لا حاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قہر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ یہاں
رہنا ہے ۱۲۸-۱۲۹)۔

۱۳ یعنی وہ اپنے زمانے کی ایک بے نظیر قوم تھے، اپنی قوت اور شان و شوکت کے اعتبار سے کوئی قوم
اُس وقت دنیا میں اُن کی نمونہ نہ تھی۔ قرآن میں دوسرے مقامات پر اُن کے متعلق فرمایا گیا ہے وَذَادُ كُفْرِي
الْخَلْقِ بَهْطَةً ۱۴ تم کو جہاں ساخت میں خوب تنومند کیا ۱۵ والأعراف ۶۹۔ فَأَمَّا عَادًا فَاسْتَكْبَرُوا

فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ﴿١٥﴾
وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ ۖ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ﴿١٦﴾

مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا۔ اور جب وہ اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُس کا رزق اُس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔

فی الارضین یغیر الحق و یألوأ من اسند متا قوۃ ، ”رہے مادنوا تہوں نے زمین میں کسی حق کے بغیر اپنی برائی کا گھنڈ کیا اور کہنے لگے کون ہے ہم سے زیادہ زور آور؟“ دہم السجدہ، آیت ۱۵۔ وَاذْأَبْطَشْتُمْ بَطْشَهُمْ جَبْتَا كَرِيۡنًا ۗ ادر تم نے جب کسی پر ہاتھ ڈالا اجتبار بن کر ڈالا (الشعر، آیت ۱۳)۔

۵۵ وادی سے مراد وادی القرظی ہے جہاں اس قوم نے پھاڑوں کو تراش تراش کر اُن کے اندر عمارتیں بنائی تھیں اور غالباً تاریخ میں وہ پہلی قوم ہے جس نے پھاڑوں کے اندر اس طرح کی عمارتیں بنانے کا سلسلہ شروع کیا تھا تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد دوم، الاعراب، حواشی ۵۷-۵۹۔ الحج، ماشیہ ۲۵۔ جلد سوم، الشعر، حواشی ۹۵-۹۹ مع تصاویر۔

۵۶ فرعون کے لیے ذوالاوتاد (میخوں والا) کے الفاظ اس سے پہلے سورہ ص آیت ۱۲ میں ہی استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُس کی فوجوں کو میخوں سے تشبیہ دی گئی ہو اور میخوں والا کا مطلب فوجوں والا ہو، کیونکہ انہی کی بدولت اُس کی سلطنت اس طرح جی ہوئی تھی جیسے نیمہ میخوں کے ذریعہ سے مضبوطی کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد فوجوں کی کثرت ہو اور مطلب یہ ہو کہ اس کے لشکر جہاں بھی جا کر ٹھہرتے تھے وہاں ہر طرف ان کے نیموں کی میخیں ہی میخیں ٹھکی نظر آتی تھیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ میخیں ہوں جن سے ٹھونک کر وہ لوگوں کو عذاب دیتا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آبرام مہر کو میخوں سے تشبیہ دی گئی ہو کیونکہ وہ فرعون کی عظمت و شوکت کے وہ آثار ہیں جو صدیوں سے زمین پر چھ کھڑے ہیں۔

۵۷ ظالموں اور مفسدوں کی حرکات پر نگاہ رکھنے کے لیے گھات لگائے ہوئے ہونے کے الفاظ تشبیہی استعار کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔ گھات اُس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی شخص کسی کے انتظار میں اس غرض کے لیے چھپا بیٹھا ہوتا ہے کہ جب وہ نہ پائے اسی وقت اُس پر حملہ کر دے۔ وہ جس کے انتظار میں بیٹھا ہوتا ہے اُسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اُس کی خبر لینے کے لیے کون کہاں چھپا ہوا ہے۔ اسٹام سے غافل، بے فکری کے ساتھ وہ اُس مقام سے گزرتا ہے اور اچانک شکار ہو جاتا ہے۔ یہی صورت حال اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اُن ظالموں کی ہے جو دنیا میں نسا کا طونان برپا کیے رکھتے ہیں۔ انہیں اس کا کوئی احساس نہیں ہوتا کہ خدا بھی کوئی ہے جو اُن کی حرکات کو دیکھ رہا ہے۔

كَلَّا بَلْ لَا تَكْرُمُونَ الْيَتِيمَ ﴿١٤﴾ وَلَا تَحْضُونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمُسْكِينِ ﴿١٥﴾
وَتَأْكُلُونَ التَّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ﴿١٦﴾ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿٢٠﴾

ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اگستے اور میراث کا سارا مال سیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو۔

وہ پوری بے غوفی کے ساتھ روز بروز زیادہ سے زیادہ شرارتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ بیان تک کہ جب وہ حد آجاتی ہے جس سے آگے اللہ تعالیٰ انہیں بڑھنے نہیں دینا چاہتا اسی وقت اُن پر اچانک اُس کے عذاب کا کوڑا برس جاتا ہے۔

۱۵ اب لوگوں کی عام اخلاقی حالت پر تنقید کر کے یہ بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی زندگی میں یہ رویہ جن انسانوں نے اختیار کر رکھا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ اُن سے کبھی باز پرس نہ ہو، اور اس بات کو عقل و اخلاق کا تقاضا کیسے مانا جاسکتا ہے کہ یہ سب کچھ کر کے جب انسان دنیا سے رخصت ہو جائے تو اُسے کسی جزا اور سزا سے سابقہ پیش نہ آئے۔

۱۶ یعنی یہ ہے انسان کا مادہ پرستانہ نظریہ حیات۔ اسی دنیا کے مال و دولت اور جاہ و اقتدار کو وہ سب کچھ سمجھتا ہے۔ یہ چیزیں تو پھول جاتے ہیں اور کتنا ہے کہ خدانے مجھے عزت دار بنا دیا، اور یہ نہ ملے تو کتنا ہے کہ خدانے مجھے ذلیل کر دیا۔ گویا عزت اور ذلت کا معیار اُس کے نزدیک مال و دولت اور جاہ و اقتدار کا ملنا یا نہ ملنا ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت جسے وہ نہیں سمجھتا یہ ہے کہ اللہ نے جس کو دنیا میں جو کچھ بھی دیا ہے آزمائش کے لیے دیا ہے۔ دولت اور طاقت دی ہے تو امتحان کے لیے دی ہے کہ وہ اُسے پاکر شکر گزار بننا ہے یا ناشکری کرتا ہے۔ غفلت اور تنگ حال بنایا ہے تو اس میں بھی اُس کا امتحان ہے کہ صبر اور فصاحت کے ساتھ راضی برضا رہتا ہے اور جائزہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی مشکلات کا مقابلہ کرتا ہے، یا اخلاق و دیانت کی ہر حد کو بچا نہ جانے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اپنے خدا کو سنے لگتا ہے۔

۱۷ یعنی یہ عزت اور ذلت کا معیار ہرگز نہیں ہے۔ تم سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ اخلاق کی بھلائی اور برائی کے بجائے تم نے اسے معیار عزت و ذلت بنا رکھا ہے۔

۱۸ یعنی جب تک اُس کا باپ زندہ رہتا ہے، اُس کے ساتھ تمام اہل بیتاؤں کچھ اور ہوتا ہے اور جب اُس کا باپ مر جاتا ہے تو ہمسایے اور دور کے رشتہ دار تو درکنار چچا اور ماموں اور بڑے بھائی تک اُس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔

۱۹ یعنی تمہارے معاشرے میں غریبوں کو کھانا کھلانے کا کوئی چرچا نہیں ہے۔ نہ کوئی خود کسی بھوکے کو کھانا کھلانے پر آمادہ ہوتا ہے، نہ لوگوں میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ بھوکوں کی بھوک مٹانے کے لیے کوئی فکر کریں اور ایک

كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۚ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا ۚ
 صَفًّا ۚ وَجَاءَ يَوْمَئِذٍ يُؤْمِنُ بِحَمَمِهِ ۚ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ
 وَأَنَّى لَهُ الذِّكْرَى ۚ يَقُولُ لِيَلَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي ۚ
 فَيَوْمَئِذٍ لَا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ۚ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ ۚ

ہرگز نہیں، جب زمین پے در پے کوٹ کوٹ کر ریگ زار بنا دی جائے گی، اور تمہارا رب جلوہ فرما ہوگا اس حال میں کہ فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے، اور حقیقت اُس روز سامنے لے آئی جائے گی، اُس دن انسان کو سمجھ آئے گی اور اس وقت اُس کے سمجھنے کا کیا حاصل؟ وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا! پھر اُس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں، اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں۔

دوسرے کو اُس کا انتظام کرنے پر آکسائیں۔

۱۳ عرب میں عورتوں اور بچوں کو تو میراث سے ویسے ہی محروم رکھا جاتا تھا اور لوگوں کا نظریہ اس باب میں یہ تھا کہ میراث کا حق صرف اُن مردوں کو پہنچتا ہے جو رٹنے اور کنبے کی حفاظت کرنے کے قابل ہوں۔ اس کے علاوہ مرنے والے کے وارثوں میں جو زیادہ طاقت ور اور بااثر ہوتا تھا وہ بلا تامل ساری میراث سمیٹ لیتا تھا اور اُن سب لوگوں کا حصہ مار کھاتا تھا جو اپنا حصہ حاصل کرنے کا بل بوتہ نہ رکھتے ہوں۔ حق اور فرض کی کوئی اہمیت ان کی نگاہ میں نہ تھی کہ ایماندار ہی کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر حق دار کو اس کا حق دینا خواہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔

۱۴ یعنی جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمہیں کوئی فکر نہیں۔ جس طریقے سے بھی مال حاصل کیا جا سکتا ہو اسے حاصل کرنے میں تمہیں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اور خواہ کتنا ہی مال مل جائے تمہاری حرص و طمع کی آگ کبھی نہیں بجھتی۔

۱۵ یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ تم دنیا میں جیتے جی یہ سب کچھ کرتے رہو اور اس کی باز پرس کا وقت کبھی نہ آئے۔ جس جزا و سزا کا انکار کر کے تم نے زندگی کا یہ ہتھیار اختیار کر رکھا ہے وہ کوئی آنسوئی اور خیالی بات نہیں ہے بلکہ وہ پیش آتی ہے اور اُس وقت آتی ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الطُّمْنَانَةُ ﴿٢٤﴾ ارْجِعِي إِلَىٰ سَرِيكِ سَاوِيَةِ
مَرْضِيَّةٍ ﴿٢٥﴾ فَأَدْخِلِي فِي عِبْدِي ﴿٢٦﴾ وَأَدْخِلِي جَنَّتِي ﴿٢٧﴾

(دوسری طرف ارشاد ہوگا) اے نفس مطمئنہ! چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اپنے انجام نیک (خوش) اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ مثال ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

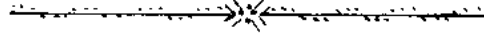
۲۴ اصل الفاظ ہیں جَاءَ سَرِيكَ جِنِّكَ كَالْفُطْفُوتِ تَرْجِعِي "تیرا رب آئے گا" لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، اس لیے لامحالہ اس کو ایک تشبیہ انداز بیان ہی سمجھنا ہوگا جس سے یہ تصور دلانا مقصود ہے کہ اُس وقت اللہ تعالیٰ کے اقتدار اور اس کی سلطانی و تماری کے آثار اُس طرح ظاہر ہوں گے جیسے دنیا میں کس بادشاہ کے تمام شکرگوں اور اعیان سلطنت کی مدد سے وہ رعب طاری نہیں ہوتا جو بادشاہ کے نفسِ نفسِ خود دربار میں آجانے سے طاری ہوتا ہے۔

۲۵ اصل الفاظ ہیں يَوْمَ مَدِينٍ بَدَدْتَكَ الْاِنْسَانَ وَاَتَىٰ لَهُ الذِّكْرُ اٰی۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اُس روز انسان یاد کرنے کا وہ دنیا میں کیا کچھ کر کے آیا ہے اور اُس پر نادم ہوگا، مگر اس وقت یاد کرنے اور نادم ہونے کا کیا فائدہ۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اُس روز انسان کو موش آئے گا، اُسے نصیحت حاصل ہوگی، اُس کی سمجھ میں یہ بات آئے گی کہ جو کچھ اُسے انبیاء نے بتایا تھا وہی صحیح تھا اور اُن کی بات نہ مان کر اُس نے حماقت کی، مگر اُس وقت موش میں آنے اور نصیحت پکڑنے اور اپنی غلطی کو سمجھنے کا کیا فائدہ۔

۲۶ نفس مطمئن سے مراد وہ انسان ہے جس نے کسی شک و شبہ کے بغیر پورے اطمینان اور خندہ سے دل کے ساتھ اللہ و حمدہ لا شریک کو اپنا رب اور انبیاء کے لائے ہوئے دین حق کو اپنا دین قرار دیا، جو عقیدہ اور جو حکم بھی اللہ اور اس کے رسول سے ملا اُسے سراسر حق مانا، جس چیز سے بھی اللہ کے دین نے منع کیا اُس سے بدنمانو استہ نہیں بلکہ اس نصیحت کے ساتھ گم گیا کہ فی الواقع وہ بری چیز ہے، جس قربانی کی بھی حق پرستی کی راہ میں ضرورت پیش آئی ہے دریغ اسے پیش کر دیا جن مشکلات اور تکالیف اور مصائب سے بھی اس راہ میں سابقہ درپیش ہوا انہیں پورے سکون قلب کے ساتھ برداشت کیا، اور دوسرے راستوں پر چلنے والوں کو دنیا میں جو فوائد و منافع اور لذائذ حاصل ہوتے نظر آ رہے تھے ان سے محروم رہ جانے پر اُسے کوئی حسرت لاحق نہ ہوئی بلکہ وہ اس بات پر پوری طرح مطمئن رہا کہ دین حق کی پیروی نے اُسے ان گندگیوں سے محفوظ نظر رکھا ہے۔ اسی کیفیت کو دوسری جگہ قرآن میں شرح صدر سے تعبیر کیا گیا ہے (الانعام، آیت ۱۲۵)۔



۱۹ یہ بات اُس سے موت کے وقت بھی کہی جائے گی، قیامت کے روز جب وہ دوبارہ اٹھ کر میلان ستر کی طرف چلے گا اس وقت بھی کہی جائے گی، اور جب اللہ کی عدالت میں پیشی کا موقع آئے گا اس وقت بھی کہی جائے گی ہر مرحلے پر اُسے اطمینان دلایا جائے گا کہ وہ اللہ کی رحمت کی طرف جا رہا ہے۔



Tafheem-ul-Quran [The Meaning of the Quran] - S Abul A'la Maududi

▼ Surah!